جاوید غامدی: امریکہ وارتقاء سہیل عمر: اقبال کی عربی استعداد

اقبال عربی نہیں جانتے تھے، سہیل عمر

[رفیع الدین ہاشمی کے نام مرتب امالی غلام محمد کے خط کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے جس میں اقبال کی عربی دانی کے حوالے سے نہایت اہم مباحث سمو دیئے گئے ہیں۔]

[۱] ''مباحث مشرقیہ'' کے حوالے سے سلیمان ندوی کے نام تین خطوط میں تین مختلف موقف ہیں ایک میں تحریر فرمایا ہے [۱۹۲۲ء] کہ مباحث شرقیہ مولوی نورالحق سے پڑھ رہا ہوں، چھ سال بعد دوسرے خط میں فرماتے ہیں کہ لاہور میں یہ کتاب دستیاب نہیں [۱۹۲۸ء] کیا آپ اس کی تلخیص میرے لیے کر دیں گے۔ ترجمہ نہیں چاہتا، پھر چند سال بعد فرماتے ہیں کہ مباحث شرقیہ زیر مطالعہ ہے۔ یہ تین متضاد موقف کس بات کی نشاندہی کرتے ہیں؟ حضرت اقبالؒ نے ۱۹۳۲ء تک شرح مواقف کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا جو مدارس عروبیہ کے عام طلباء پڑھ لیتے ہیں۔ ابن عربی کا مطالعہ تیرہ سال تک سلیمان ندویؒ کے ملخص کے لیے ٹلتا رہا، اس کی توجیہہ سوائے اس کے کیا کی جاسکتی ہے کہ اقبال عربی زبان سے واقف نہ تھے۔ [۲] علامہ صاحب کی عربی استعداد کے بارے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کے گھر کھانے پر طاہر مسعود اور آپ کی موجودگی میں راقم نے سہیل عمر صاحب سے استفسار کیا تھا تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ اقبال عربی نہیں جانتے تھے۔ پہلے پہل راقم نے اسے سہیل عمر کا ذاتی موقف سمجھا لیکن مکاتیب اقبال میں سلیمان ندوی کے نام چند خطوط، صوفی تبسم کے نام خط اور ڈاکٹر شجاع کے نام خط سے سہیل عمر کے موقف کی تائید ہوتی ہے کیا میں سہیل عمر صاحب کی طرح کسی غلط نتیجے پر تو نہیں پہنچ گیا؟ تصحیح فرما دیجیے۔ [۳] مکاتیب کے مطابق علامہ اقبال نے علماء وسلیمان ندوی سے عربی ادبیات، لسانیات، لغات کے حوالے سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے کیا وہ عربی نہیں جانتے تھے؟ [۴] ۱۹۳۳ء میں بعض عربی کتابوں کے بارے میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں ''کیا آپ کے کتب خانے میں موجود ہیں اگر ہوں تو میں چند روز کے لئے آؤں اور آپ کی مدد سے ان میں سے بعض کو دیکھ سکوں [خط نمبر ۶۳]۔ فی الحال مولوی نورالحق کی مدد سے مباحث شرقیہ دیکھ رہا ہوں [جرمنی سے عربی میں پی ایچ ڈی لے کر مولوی نورالحق کی مدد سے عربی کتاب پڑھنا عجیب بات ہے]۔ [۵] ۱۹۳۲ء میں شجاع کے نام لکھتے ہیں ''میں نے طالب علمی کے زمانے میں خاصی عربی سیکھ لی تھی مگر بعد میں اور مشاغل کی وجہ سے اس کا مطالعہ چھوٹ گیا۔ [عربی میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد علامہ نے عربی میں مطالعہ ہی نہیں کیا لیکن اسلام پر نقد فرما رہے ہیں محدثین پر سنت پر غالباً اسی تاسف کے باعث اقبال نے رجوع کر لیا تھا]۔ [خط نمبر ۱۱۵] [۶] کیا آپ کسی ایسے بزرگ کا نام تجویز فرما سکتے ہیں جس کی نظر فقہ اسلام واصول فقہ وتفسیر پر وسیع ہو اور جو شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور ان کی کتابوں پر پوری بصیرت رکھتا ہو ایسے بزرگ کو اپنے پاس رکھوں گا اور اس مدد کا جو مجھے ان سے ملے گی مناسب معاوضہ دوں گا [خط نمبر ۳۷۳، ۱۹۳۶ء] [۷] ۱۹۲۵ء میں صوفی تبسم کے نام لکھتے ہیں میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے فرصت کے اوقات میں اضافے کی کوشش کرتا ہوں یہ ذاتی اطمینان کے لئے نہ کہ تعلیم وتعلم کی غرض سے..... اجتہاد پر مضمون لکھا تھا..... مگر احساس ہوا کہ یہ مضمون اس قدر آسان نہیں جیسے ابتداء میں تصور کیا تھا مضمون اس قابل نہیں کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں اسلام کا مطالعہ مغربی نقطہ نظر سے کرتا ہوں اور اب یہ طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ کہ دانستہ یا نادانستہ اسی نقطہ نظر سے اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔ [خط نمبر ۲۱] [۸] ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد وزندقہ کے کچھ نہیں اس پر مفصل لکھوں گا [خط نمبر ۲۰] جبکہ اقبال نے فصوص اس وقت بھی نہیں پڑھی تھی پھر ۱۹۳۳ء میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عربی کے بحث زماں کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہوگی [خط نمبر ۶۳] ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں کہ محی الدین عربی کی کتاب فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے حوالے مطلوب ہیں [خط نمبر ۸۲] مہربانی کر کے دیکھئے کہ ابن عربی نے کیا مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے۔ [خط نمبر ۹۵] حضرت شیخ اکبرؒ نے تعلیم حقیقت زمان کے متعلق کیا کہا ہے اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون سی کتب میں پائی جاتی ہیں اور کہاں کہاں [خط نمبر ۲۳۸] ۱۹۱۸ء میں لکھتے ہیں کہ میں نے تو محی الدین اور منصور حلاج کے عقائد اور خیالات سے بے زاری ضرور ظاہر کی ہے۔ [خط نمبر ۲۷۱] ۱۹۱۸ء میں حضرت شیخ اکبر صرف محی الدین تھے ۱۹۳۳ء میں انھیں حضرت شیخ اکبر رحمتہ اللہ علیہ کا خطاب مل گیا۔ [خط نمبر ۲۳۸] [۹] ۱۹۳۷ء میں لکھتے ہیں دانتے کی کتاب کا میڈی شاید محی الدین عربی کے افکار وتخیلات سے لبریز ہے [خط نمبر

۴۲۵][۱۰] پنڈت نہرو کو لکھتے ہیں ذاتی طور پر دینیات سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تاہم میں اس میں بھی دخیل ہوا تھا کہ احمدیوں کو انہی کی زبان میں جواب دیا جا سکتا۔ [خط نمبر ۳۹۱] اس تمام خط و کتابت سے تو علامہ اقبال کی عربی دانی کی صلاحیت حد درجہ مشکوک ہو جاتی ہے اور سہیل عمر صاحب کا موقف وزنی ہو جاتا ہے کہ اقبال عربی نہیں جانتے تھے آپ کیا فرماتے ہیں۔ [۱۱] علامہؒ نے قرآن پر جو نوٹس تحریر فرمائے تھے اور کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے کیا ان نوٹس کی نقل دستیاب ہے؟ [۱۲] پنڈت نہرو کے نام خط میں اقبال نے لکھا ہے کہ دینیات سے کوئی دلچسپی نہیں'' اس جملے کی کیا تشریح، توضیح، توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ [۱۳] کیا ۱۹۳۷ سے پہلے علامہ اقبال کے تفصیلی حالات زندگی کہانی کی صورت میں یا مضمون کی صورت میں کہیں شائع ہوئے ہیں۔ [۱۴] جناب جاوید غامدی صاحب نے نومبر ۲۰۰۵ء میں مرکز یہ مجلس اقبال کے تحت تقریر میں خطبات کی تعریف و توصیف فرمائی ہے۔ کیا غامدی صاحب خطبات کی اغلاط سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں سنا ہے کہ فلسفے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو خطبات ان کی سمجھ سے بالاتر تو نہیں رہے۔ پھر خطبات کی گمراہیوں کے باوجود غامدی صاحب نے اسے سند عطا فرمادی اس کی کیا وجہ ہے؟ ان کے فکری حلیف ڈاکٹر الطاف اعظمی نے تو خطبات پر سخت تنقید کی ہے اور کتاب ان کے ہم خیال ادارے دارالتذکیر سے شائع ہوئی ہے۔ کیا غامدی صاحب نے اس کتاب کا مطالعہ بھی نہیں کیا؟ کیا غامدی صاحب جنت و دوزخ کو مقامات نہیں سمجھتے اور انھیں احوال کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ تصوف کے وہ شدید مخالف ہیں خصوصاً وجودی تصوف کے لیکن خطبات میں تو تصوف سے بھی استدلال موجود ہے۔ میری دانست میں تو غامدی صاحب کی فکر خطبات کے متوازی ہے، لیکن اس تقریر میں صورت حال مختلف ہے۔ کیا غامدی صاحب کے مکتب فکر نے اپنے اصول و مبادی کیا پھر تبدیل کر دیئے ہیں کیونکہ ارتقاء ان کی علمی شان و شوکت کا خاص رنگ ہے اور اس قدر تیزی سے ہوتا ہے کہ بے چارے نیاز مند اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ [غالباً ابھی تک غامدی صاحب نے ارتقاء کے اصول و مبادی بھی تحریر نہیں فرمائے شاید اس سے ارتقاء کی وسعت کا دائرہ تنگ ہونے کا خطرہ ہے۔] پہلے غامدی صاحب دبستان شبلی فراہی و اصلاحی کے اصول و مبادی پر ایمان رکھتے تھے پھر انھوں نے اپنے اصول و مبادی تحریر فرمائے اور شبلی فراہی و اصلاحی کے اصولوں سے کامل انحراف کیا۔ اعتراف پھر بھی نہ کیا۔ اب اپنے طے شدہ اصول و مبادی سے بھی منحرف ہیں۔ اجماع امت سے دین کو سمجھنے کے اصول و مبادی کا تو وہ پہلے ہی انکار کر چکے تھے اب اپنے اصول و مبادی کا بھی انکار فرما دیا ہے ورنہ ''خطبات اقبال'' کو سند عطا کرنا ان اصول و مبادی سے انحراف کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ تفصیل اس تناظر میں بیان کر رہا ہوں کہ جناب سہیل عمر صاحب غامدی صاحب سے بے حد متاثر ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں غامدی سے اچھی عربی کون جانتا ہے جس پر راقم نے کہا تھا کہ کیا عربی دانی معیار حق ہے؟ یہ بھی عرض کیا تھا کہ آپ کا بیان محض منطقی اور سائنسی مفروضہ ہے کیونکہ پاکستان میں عربی پر عبور رکھنے والے علماء کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہے۔ آپ نے دس علماء سے بھی ملاقات نہیں کی اور اپنا سائنسی مفروضہ بیان کر دیا کہ اگر کوئی اتفاق نہیں رکھتا تو وہ Falcification کے تحت اسے غلط ثابت کر دے جب تک یہ مفروضہ غلط ثابت نہ ہو، آپ سائنٹفک میتھڈ کے تحت اسی مفروضے پر ایمان رکھیں گے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کے گھر عشائیے میں انھوں نے آپ کی موجودگی میں غامدی صاحب کے حوالے سے جب گفتگو کی تو راقم نے ان سے غامدی صاحب کے فکر کے بارے میں چند سوالات کیے جن کا وہ جواب نہ دے سکے تھے اور ان کا تبصرہ یہ تھا کہ کراچی والے غامدی صاحب کے بہت خلاف معلوم دیتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میرا سوال صرف یہ تھا کہ غامدی صاحب دین کے صرف دو ماخذ تسلیم کرتے ہیں، قرآن و سنت پھر سنت کو وہ چالیس کے ہندسے میں محصور کر دیتے ہیں۔ پندرہ سو سال کے ذخیرہ احادیث اور امت کے تعامل و تاریخ کے مطالعے کے بعد غامدی صاحب نے چالیس کا ہندسہ سنت کے لیے منتخب فرما لیا لیکن اگلے ہی سال داڑھی کو سنت کی فہرست سے خارج کر کے فطرت کی فہرست میں داخل کر دیا۔ راقم نے سہیل عمر صاحب سے استفسار کیا تھا کہ غامدی صاحب نے سنت کی جو تعریف ۱۹۹۵ء میں متعین فرمائی تھی اس کے اصول و مبادی کے تحت سنتیں صرف چالیس رہ گئیں اور داڑھی بھی اس کا حصہ بن گئی تھی تو اچانک اگلے ہی سال ان اصول و مبادی کے انحراف میں داڑھی فطرت میں کیسے داخل ہو گئی اور ۲۰۰۴ء تک آتے آتے سنتوں کی یہ فہرست گھٹتے بڑھتے صرف ۳۶ تک محدود رہ گئی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنت بھی اصلاً ماخذ قانون نہیں ہے اور صرف قرآن ہی ماخذ قانون ہے۔ اس پر سہیل عمر صاحب مسکرا کر رہ گئے۔ لاہور جا کر انھوں نے یہ اعتراض غامدی صاحب کی خدمت میں پیش فرمائے اور اگلے ماہ جب کراچی تشریف لائے تو پروفیسر ڈاکٹر طاہر مسعود کے گھر عشائیے میں غامدی صاحب کے ردعمل سے مجھے آگاہ فرمایا کہ ''خالد جامعی صاحب مجھ سے براہ راست یہ سوالات پوچھ لیتے تو ان کی غلط فہمی رفع ہو جاتی'' اس عشائیے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل، جمال پانی پتی، سجاد میر، فراست رضوی بھی تشریف فرما تھے۔ راقم نے غامدی

صاحب کے جواب میں سہیل عمر سے عرض کیا تھا کہ تحریر موجود ہو تو استفسار کی ضرورت نہیں رہتی۔ غلط فہمی کا امکان صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب زبانی روایت پر اعتراض وارد کیا گیا ہو۔ تحریری طور پر غامدی صاحب کے تین مختلف موقف بغیر کسی شرح وضاحت اور توجیہہ کے موجود ہوں تو غلط فہمی معترض کو لاحق نہیں ہوئی۔ یہ تفصیل اس لیے درج کی گئی ہے کہ خطبات پر سلیمان ندوی کے نقد کی اشاعت کے بعد سہیل عمر صاحب نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ وہ اس نقد کے سلسلے میں جاوید اقبال اور غامدی صاحب سے گفتگو کریں گے اور خطبات اقبال کے متن پر ایک اجلاس بھی طلب فرمائیں گے، جہاں مباحثہ ہوگا کیا غامدی صاحب خطبات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ میری دانست میں تو سرسری نظر بھی نہیں رکھتے کیونکہ نومبر ۲۰۰۵ء کے اشراق میں ان کی تقریر میرے موقف کی تائید کرتی ہے۔ اگر خطبات کا غامدی صاحب نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہوتا تو اس قسم کی سطحی سرسری اور غیر علمی گفتگو نہ فرماتے۔ احمد جاوید سہیل عمر ڈاکٹر منظور احمد [ریکٹر اسلامی یونیورسٹی]، اور ہمارے مشترکہ دوست جناب فراست رضوی کو عثمان انسٹی ٹیوٹ میں غامدی صاحب کے پروگرام میں ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے مدعو فرمایا تھا۔ [فراست رضوی صاحب سلیم احمد شمیم احمد، سراج منیر، حسن عسکری، بابا ذہن شاہ تاجی، جوش ملیح آبادی، جمال پانی پتی، علامہ طالب جوہری، جسٹس تقی عثمانی، ڈاکٹر منظور احمد اور نہ جانے کن کن اکابرین کے دوست، رفیق، شاگرد تربیت یافتہ اور صحبت یافتہ ہیں۔ اپنی ذات میں ایک انجمن اور یادوں کا دبستان بھی] فراست رضوی غامدی صاحب سے تین بنیادی سوالات پوچھنا چاہتے تھے۔ غلطی یہ کی کہ سوالات کا پرچہ امتحان سے پہلے جاری کر دیا۔ ڈاکٹر منظور [ریکٹر اسلامی یونیورسٹی] نے سوالوں کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے انھیں بھری محفل میں سوالات کرنے کی اجازت نہ دی۔ فراست رضوی صاحب بار بار کھڑے ہوئے لیکن ان سے کہہ دیا گیا کہ یہ طالب علموں کا اجتماع ہے یہاں صرف طالب علمانہ سوالات کیے جا سکتے ہیں تشریف رکھیے، چائے کے وقفے پر منظور صاحب نے غامدی صاحب سے تنہائی کے احباب خاص میں فراست رضوی کی ملاقات کرائی اور ان سے کہا کہ اب سوالات پوچھیے جب سوالات پوچھے گئے تو غامدی صاحب جواب نہ دے سکے۔ جس پر ڈاکٹر منظور احمد نے بھی ناراضگی اور تحیر کا اظہار کیا۔ سنت کے بارے میں ان کے سوالات کا غامدی صاحب کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ فرمایا کہ پہلے چالیس تھیں پھر ۳۹ رہ گئیں اب صرف ۳۶ ہیں تو اس میں کوئی تضاد یا تعارض نہیں ہے۔ ہم نے ان کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا ہے جس سے یہ اشتباہ پیدا ہو گیا کہ سنتیں کم ہو رہی ہیں، آپ غور سے دیکھیں اصلاً سنتوں کی تعداد چالیس ہی ہے۔ داڑھی کا مسئلہ الگ ہے اس کے لیے میری کتاب آ رہی ہے۔ فراست رضوی کا دوسرا سوال راولپنڈی میں خورشید احمد ندیم شاگرد رشید جاوید غامدی کے نئے تحقیقی ادارے سے متعلق تھا جو پچاس کتابیں شائع کر چکا ہے اور امریکی فنڈ سے چلایا جا رہا ہے۔ کتاب پر باقاعدہ ایشیا فاؤنڈیشن کی مالی سرپرستی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ غامدی صاحب کے افکار ڈاکٹر فاروق کے نام سے پیش کیے جاتے ہیں جس پر غامدی صاحب نے ادارے اور ادارے کے سربراہ سے قطعاً لاتعلقی ظاہر فرمائی۔ غامدی صاحب کے جوابات سے منظور احمد بھی مطمئن نہ ہوئے اور انھوں نے شدید دل گرفتگی کا اظہار کیا لیکن معلوم نہیں کیوں ہمارے سہیل عمر صاحب غامدی صاحب کو استاد الکل سمجھتے ہیں۔ کیا ان کا فہم اسلام و اقبال جاوید غامدی صاحب سے ماخوذ ہے؟ فراست رضوی کا تیسرا سوال ذہنی ارتقاء سے متعلق تھا کہ غامدی صاحب کے ذہنی ارتقاء کے اصول و مبادی کیا ہیں اور اس کی حدود کیا ہیں؟ کیا نصوص کی تعبیر و تشریح میں بھی ارتقاء ممکن ہے اور فکر کے ارتقا پذیر ہونے کے بعد سابقہ فکر سے برأت کا تحریری اعلان کیوں نہیں کیا جاتا تا کہ نیاز مندوں کو حقیقت سے آگہی حاصل ہو۔ [راقم نے اسی نوعیت کا سوال دانش سراء کراچی بہادر آباد کے ایک خاص اجلاس میں محترم معز امجد صاحب سے کیا تھا کہ سنت اگر ماخذ قانون ہے تو قانون تبدیل کیوں ہو رہا ہے اور تبدیل ہو گیا ہے تو ماخذ کہاں رہا؟ اس پر انھوں نے کہا کہ فکری ارتقاء جاری رہتا ہے یہ تو استاد محترم کی شان ہے کہ فکر نمو پذیر ہے۔ ان سے دوسرا سوال راقم نے کیا تھا کہ کیا فکری ارتقاء ماخذات دین اور نصوص میں بھی جائز ہے۔ ارتقاء کے بجائے رجوع کیا مناسب اصطلاح نہیں ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ شاید رجوع سے بہتر اصطلاح ''تخلیقی قوت'' ہو۔ تیسرا سوال یہ تھا کہ فکری ارتقاء کا تحریری اظہار یا اعتراف یا سابق نقطہ نظر سے برات کا اعلان کیوں نہیں کیا جاتا کسی تحریر پر یہ درج نہیں ہوتا کہ یہ ترمیم شدہ، نظر ثانی شدہ اشاعت ہے، یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ پہلی اشاعت ہے یا چوتھی اشاعت ہے تا کہ قاری دونوں اشاعتوں کے فرق خود دیکھ سکے۔ ہر نئی اشاعت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نقش اول ہے، جب رائے بدل گئی اور ارتقاء ہو گیا تو اس کا اظہار ہونا چاہیے۔ اگر مصلحت پیش نظر ہے تو کم از کم مولانا اشرف تھانوی کی طرح ''ترجیح الراجح'' کے نام سے کتاب شائع کی جائے جس میں غامدی صاحب کے فکری ارتقاء کی داستان سمو دی جائے اور ان کے رجوع کا سفر محفوظ ہو جائے، جدیدیت پسندوں کے پاس رجوع کی اصطلاح بھی معیوب ہوتی ہے، اسے وہ ''ارتقاء'' کہتے ہیں۔ لفظ رجوع سے رجعت کی بو آتی ہے جو جدیدیت کے متوازی ہے۔